Majallah-yi Talim o Tahqiq

مجلہ تعلیم و تحقیق

Markaz Talim o Tahqiq, Gulshan-e-Taleem,
Sector H-15, Islamabad, Pakistan

مرکز تعلیم و تحقیق، گلشنِ تعلیم، ایچ۔۱۵، اسلام آباد، پاکستان

ISSN (P): 2618-1355, ISSN (Online): 2618-1363

Issue 3, Vo ,July- September,2025

شمارہ ۳، جلد ۷، جولائی — ستمبر، ۲۰۲۵

قرآن مجید میں ضمائر کے بعض استعمالات: 'تدبرِ قرآن' اور روایتی تفسیری ذخیرے کی روشنی میں تجزیاتی و تقابلی مطالعہ

Some Qur'anic Usages of Pronouns: An Analytical and Comparative Study in the Light of *Tadabbur-i-Qur'an* and Traditional Exegetic Literature

محمد مشتاق احمد[1]

Abstract

Tadabbur-i-Qur'an of Mawlana Amin Ahsan Islahi contains highly valuable discussions on stylistic and linguistic analysis of the Qur'anic verses. However, generally, in his analysis, Islahi does not make references to the classical scholars, and only in a few places he cites the earlier exegetes and shows that they had expressed the same view before him. As these instances are very few, a general reader either considers these discussions as Islahi's unique contributions or dismisses them as his isolated opinions, unworthy of serious consideration. A thorough analysis of such discussions is, therefore, needed which would not only enhance the scholarly value and credibility of Islahi's work, but also help establish its rightful place within the broader Islamic intellectual tradition.

The present paper examines Islahi's views on certain usages of pronouns (*dama'ir*) in light of the traditional *tafsir* corpus. The general principles concerning the use of pronouns are that their referent typically appears earlier in the discourse, that they refer to the nearest antecedent nouns, that disjointed use of pronouns is considered a flaw in speech and that pronouns refer precisely to the specific nouns to which they are grammatically linked. However, in eloquent speech, these principles are sometimes deviated from because of different rhetorical and stylistic demands. Islahi has quite effectively explained such instances in his exegesis of the Qur'an.

The paper shows that Islahi's opinions on these instances are neither novel nor can they be considered his exclusive innovation. More often than not, his views are inspired either by al-Zamakhshari's *al-Kashshaf* or by his critique found in al-Razi's *Mafatih al-Ghayb*. The influence of Ibn al-Qayyim on Islahi is also quite evident. However, the credit goes to Isalhi for choosing those opinions from these sources which are consistent with his broader theoretical framework. Moreover, he applies these principles consistently throughout his work and does not fall into internal contradiction.

Key Words: Pronouns, Referent, Antecedents, Exegesis

[1] ۔پروفیسر و سربراہ، شعبۂ شریعہ و قانون، شفاء تعمیرِ ملت یونیورسٹی، اسلام آباد(mushtaq.dsl@stmu.edu.pk)۔

تمہید

مولانا امین احسن اصلاحی (م 1997ء) کی تفسیر 'تدبرِ قران' کو عام طور پر 'نظمِ قرآن' کے مخصوص تصور کے لیے جانا جاتا ہے۔[2] تاہم اس تفسیر میں قرآن مجید کے اسالیب اور لغوی تحقیق پر بھی بہت مفید مباحث ملتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر مباحث متقدمین کے حوالوں کے بغیر ہوتے ہیں اور صرف چند مقامات پر ہی مولانا اصلاحی متقدمین میں کسی کا حوالہ دے کر بتاتے ہیں کہ انھوں نے بھی یہ بات ان سے قبل کہی ہے۔[3] اس لیے ایک عام قاری یا تو ان مباحث کو مولانا اصلاحی کی خصوصیت سمجھ کر ان کی تعریف کرتا ہے، یا اسے ان کا 'تفرد' قرار دے کر نا قابلِ اعتنا قرار دیتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے تمام مباحث کا تجزیہ کرکے دیکھا جائے کہ ان میں مولانا اصلاحی نے کون سی بات کہاں سے لی ہے، اور کہاں ان کی رائے کو واقعی تفرد کی حیثیت حاصل ہے۔ ایسے تجزیے سے نہ صرف مولانا اصلاحی کے کام کی وقعت اور استناد میں اضافہ ہوگا، بلکہ مسلمانوں کی علمی روایت میں اس کے مناسب مقام اور حیثیت کی تعیین میں بھی مدد ملے گی۔

زیرِ نظر مقالے میں ضمائر کے بعض استعمالات کے متعلق مولانا اصلاحی کی رائے کا جائزہ روایتی تفسیری ذخیرے کی روشنی میں لیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ ان مثالوں میں ذکر کی گئی بعض آرا اگرچہ اردو خوان طبقے کے لیے کچھ انوکھی ضرور تھیں لیکن ان میں کوئی رائے ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں کی علمی روایت میں پہلے سے موجود نہیں تھی۔ اس لیے ایسی آرا کو انوکھی آرا کے طور پر لینے کے بجاے اس تجزیے کی ضرورت ہے کہ دیگر کئی آرا کی موجودگی میں مولانا اصلاحی نے یہ مخصوص رائے کیوں اختیار کی اور اس کا ان کے عمومی فکری نظام سے کیا ربط ہے؟

پہلا مبحث: جب ضمیر کا مرجع ملفوظ کے بجاے مفہوم ہو۔

ضمیر کے متعلق عام اصول یہ ہے کہ اس کا مرجع پیچھے کلام میں مذکور ہوتا ہے لیکن بعض اوقات کلام میں صراحت کے ساتھ مذکور نہ ہونے کے باوجود سیاقِ کلام سے وہ خود ذہن میں آجاتا ہے۔

پہلی مثال

سورۃ الواقعہ، آیات 27-28، میں حوروں کے لیے جمع مؤنث کی ضمیر استعمال ہوئی ہے، اگرچہ پیچھے کلام میں ان کا ذکر نہیں ہے لیکن سیاقِ کلام ضمیر کا مرجع واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے:

> وَأَصْحَٰبُ ٱلْيَمِينِ مَآ أَصْحَٰبُ ٱلْيَمِينِ فِى سِدْرٍ مَّخْضُودٍ وَطَلْحٍ مَّنضُودٍ وَظِلٍّ مَّمْدُودٍ وَمَآءٍ مَّسْكُوبٍ وَفَٰكِهَةٍ كَثِيرَةٍ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ إِنَّآ أَنشَأْنَٰهُنَّ إِنشَآءً فَجَعَلْنَٰهُنَّ أَبْكَارًا عُرُبًا أَتْرَابًا لِّأَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ۔ اور رہے دائیں ہاتھ والے تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! بے خار بیریوں، تہ بہ تہ کیلوں اور پھیلے ہوئے سایوں میں۔ اور پانی بہایا ہوا۔ میوے فراواں۔ نہ کبھی منقطع ہونے والے نہ کبھی ممنوع۔ اور اونچے بستر ہوں گے اور ان (کی بیویوں) کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہوگا۔ پس ہم ان کو رکھیں گے کنواریاں۔ دل ربا اور ہم سِنیں۔

---

[2] اس تصور کے مطابق قرآن مجید کی ہر سورت ایک مکمل اکائی ہوتی ہے جس کی تمام آیتیں ایک مخصوص موضوع ('عمود') کے بارے میں ہوتی ہیں؛ پھر ہر سورت کا ایک جوڑا ہوتا ہے اور دو دو سورتوں کے جوڑے دیگر سورتوں کے ساتھ مل کر ایک گروپ بناتے ہیں؛ اس طرح کے کل سات گروپ ہیں جن میں ہر گروپ کی ابتدا مکی سورت سے ہوتی ہے اور اختتام مدنی سورت پر ہوتا ہے؛ ان میں ہر گروپ کا بھی ایک مرکزی موضوع/عمود ہوتا ہے۔ اس تصور کے تفصیلی تنقیدی جائزے کے لیے دیکھیے: محمد مشتاق احمد، ''جناب جاوید احمد غامدی کا تصورِ نظمِ قرآن: ایک تنقیدی جائزہ''، ششماہی مجلہ الایضاح، ج42، ش1 (جنوری-جون 2024ء)، ص124-139۔

[3] ایسے ایک مقام کا ذکر اس مقالے میں آرہا ہے۔

مولانا اصلاحی کہتے ہیں:

''یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیویوں کے لیے ضمیر بغیر کسی مرجع کے آگئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ضمیر کے لیے لفظوں میں کوئی مرجع نہیں ہے لیکن قرینہ نہایت واضح موجود ہے۔ عربی میں مثل ہے کہ ' الشئ بالشئ یذکر ' بات سے بات یاد آتی ہے۔ یہاں بچھونوں کے ذکر کے بعد بیویوں کا ذکر اسی نوع کی چیز ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں تختوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ بیویوں کا ذکر آیا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر یہاں ان کا ذکر محض ضمیر سے کر دیا جس میں ایجاز کی بلاغت بھی ہے اور خواتین کے ذکر میں پردہ داری کے لحاظ کی تعلیم بھی۔''[4]

کئی قدیم مفسرین نے بھی یہ تاویل کی ہے۔ مثال کے طور پر علامہ جاراللہ الزمخشری (م538ھ/1143ء) فرماتے ہیں:

أضمر لهنّ، لأنّ ذكر الفرش، وهي المضاجع، دلّ عليهن۔[5] ان (حوروں) کے لیے ضمیر کا استعمال کیا کیونکہ فرش، جو کہ بستر ہیں، کا ذکر ان پر دلالت کرتا ہے۔

امام فخر الدین الرازی (م606ھ/1209ء) نے اس مسئلے کی بہت خوبصورت تنقیح کی ہے اور دکھایا ہے کہ کیوں یہاں ضمیر کا مرجع لفظ میں ذکر ہوئے بغیر بھی واضح ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آیت میں (حُورٌ عِينٌ) کا ذکر ہے، لیکن وہ السابقون الاولون کے سیاق میں ہے، جبکہ یہاں اصحاب الیمین کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اسی طرح وہ اس رائے کو بھی مرجوح قرار دیتے ہیں کہ فُرُش سے مراد مجازی طور پر عورتیں اور ضمیر ان کی طرف راجع ہے۔ اس کے بعد واضح کرتے ہیں کہ ضمیر عورتوں کی طرف راجع ہے جو اگرچہ لفظ میں مذکور نہیں، لیکن فُرُش کے ذکر سے معلوم ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن مجید سے کئی دیگر مثالیں دی ہیں جہاں عورتوں کے بجائے ان کی بعض خصوصیات ذکر کی گئی ہیں، جیسے (قاصِراتُ الطَّرفِ)[6] ''نیچی نگاہوں والیاں'' اور (مَقْصُوراتٌ)[7] ''حفاظت سے رکھی گئیں''۔[8]

علامہ طاہر بن عاشور (م1393ھ/1971ء) نے بھی یہی بات یوں بیان کی ہے:

فَإِنَّ ذِكْرَ الْفُرُشِ يَسْتَلْزِمُ أَنَّ لِلْفِرَاشِ امْرَأَةً۔۔۔ لَمَّا جَرَى ذِكْرُ الْفُرُشِ، وَهِيَ مِمَّا يُعَدُّ لِلِاتِّكَاءِ وَالِاضْطِجَاعِ وَقْتَ الرَّاحَةِ فِي الْمَنْزِلِ، يخْطر بالبال بادیء ذِي بَدْءٍ مُصَاحَبَةُ الْحُورِ الْعِينِ مَعَهُمْ فِي تِلْكَ الْفُرُشِ۔[9] کیونکہ بستروں کے ذکر سے لازم آتا ہے کہ بستر پر عورت ہو گی۔۔۔ جب بستروں کا ذکر ہوا، جو کہ گھر میں آرام کے وقت ٹیک لگانے اور لیٹنے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں، تو ذہن میں فوری طور پر ان بستروں پر آہو چشم عورتوں کی مصاحبت کا خیال آتا ہے۔

---

[4] امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، 2001ء)، ج8، ص167-168۔

[5] أبو القاسم محمود بن عمرو بن أحمد، الزمخشري ، الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل (بيروت: دار الكتاب العربي، 1407ھ)، ج4، ص461۔ اسی طرح امام جمال الدین أبو الفرج عبد الرحمان بن علي ابن الجوزي (م597ھ/1201ء) نے یہ قول امام ابن قتیبہ (م276ھ/889ء) سے نقل کیا ہے: اكتفى بذِكْر الفُرُش لأنها محل النساء عن ذكرهن۔ (زاد المسير في علم التفسير (بيروت: دار الكتاب العربي، 1422ھ)، ج4، ص223)

[6] القرآن، 56:55۔

[7] القرآن، 72:55۔

[8] أبو عبد الله محمد بن عمر بن الحسن الرازي، مفاتيح الغيب (بيروت: دار إحياء التراث العربي، 1420ھ)، ج29، ص407۔

[9] محمد الطاهر بن عاشور التونسي، تحرير المعنى السديد وتنوير العقل الجديد من تفسير الكتاب المجيد (تونس: الدار التونسية للنشر، 1984م)، ج22، ص90۔

دوسری مثال

سورۃ الاحزاب، آیت 53، میں رسول اللہ ﷺ کے گھر میں داخل ہونے کے آداب بیان کیے جارہے ہیں اور اس ضمن میں ازواجِ مطہرات کا نام لیے بغیر ان کی طرف ضمیر راجع کی گئی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَدْخُلُواْ بُيُوتَ ٱلنَّبِيِّ إِلَّآ أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَٰظِرِينَ إِنَىٰهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَٱدْخُلُواْ فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَٱنتَشِرُواْ وَلَا مُسْتَـْٔنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى ٱلنَّبِيَّ فَيَسْتَحْىِۦ مِنكُمْ وَٱللَّهُ لَا يَسْتَحْىِۦ مِنَ ٱلْحَقِّ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَٰعًا فَسْـَٔلُوهُنَّ مِن وَرَآءِ حِجَابٍ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُواْ رَسُولَ ٱللَّهِ وَلَآ أَن تَنكِحُوٓاْ أَزْوَٰجَهُۥ مِنۢ بَعْدِهِۦٓ أَبَدًا إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِندَ ٱللَّهِ عَظِيمًا۔ اے ایمان والو، نبی کے گھروں میں نہ داخل ہو مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے۔ نہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی تیاری کا۔ ہاں جب تم کو بلایا جائے تو داخل ہو، پھر جب کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہو۔ یہ باتیں نبی کے لیے باعث اذیت تھیں لیکن وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے، اور اللہ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اور جب تم کو ان (ازواج نبی) سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو، یہ طریقہ تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔ اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے کبھی اس کے بعد نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین باتیں ہیں۔ تم کسی چیز کو ظاہر کرو، خواہ چھپاؤ، اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ میں جمع مؤنث کی ضمیر آئی ہے جس کے متعلق ظاہر ہے کہ وہ امہات المؤمنین کی طرف راجع ہے، اگرچہ آیت میں پہلے ان کا ذکر صراحت سے نہیں ہوا مولانا اصلاحی اس بارے میں کہتے ہیں:

"ضمیر کا مرجع ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ اوپر بُيُوتَ ٱلنَّبِيِّ کا ذکر ہو چکا ہے اس وجہ سے ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کے ذکر کے لیے نہایت واضح قرینہ موجود تھا۔"[10]

ابن عاشور نے اس مقام پر لکھا ہے:

وَضَمِيرُ (سَأَلْتُمُوهُنَّ) عَائِدٌ إِلَى الْأَزْوَاجِ، الْمَفْهُومِ مَنْ ذِكْرِ الْبُيُوتِ فِي قَوْلِهِ: (بيُوتَ النَّبِي)؛ فَإِنَّ لِلْبُيُوتِ رَبَّاتَهُنَّ، وَزَوْجُ الرَّجُلِ هِيَ رَبَّةُ الْبَيْتِ۔۔۔ وَقَدْ كَانُوا لَا يَبْنِي الرَّجُلُ بَيْتًا إِلَّا إِذَا أَرَادَ التَّزَوُّجَ. وَفِي حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ: كُنْتُ عَزَبًا أَبِيتُ فِي الْمَسْجِدِ. وَمِنْ أجل ذَلِك سموا الزِّفَافَ بِنَاءً. فَلَا جَرَمَ كَانَتِ الْمَرْأَةُ وَالْبَيْتُ مُتَلَازِمَيْنِ؛ فَدَلَّتِ الْبُيُوتُ عَلَى الْأَزْوَاجِ بِالِالْتِزَامِ. وَنَظِيرُ هَذَا قَوْلُهُ تَعَالَى: (وَفُرُشٍ مَرْفُوعَةٍ إِنَّا أَنْشَأْناهُنَّ إِنْشاءً۔[11] "اور جب تم ان سے مانگو" میں ضمیر ازواج نبی کی طرف راجع ہے جو آیت کی ابتدا میں "پیغمبر کے گھروں" کے ذکر سے خود بخود سمجھ میں آتا ہے کیونکہ گھروں کی مالکن ہوتی ہیں اور کسی شخص کی بیوی اس کے گھر کی مالکن ہوتی ہے۔۔۔ عربوں میں کوئی شخص گھر تبھی بناتا جب اس کا شادی کا ارادہ ہوتا؛ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ میں کنوارا تھا اور مسجد میں رات گزارتا تھا؛ عرب اسی وجہ سے شادی کو گھر بنانا کہتے تھے۔ پس گھر اور عورت لازم و ملزوم تھے، اور گھروں سے لازماً عورتوں پر دلالت ہوئی۔ اس کی مثال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اور ان کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہو گا۔"

[10] تدبر قرآن، ج 6، ص 264۔

[11] التحریر والتنویر، ج 22، ص 90۔

دوسرا مبحث: جب ضمیر کا مرجع قریب ترین نہ ہو۔

عام طور پر ضمیر قریب ترین اسم کی طرف راجع ہوتا ہے لیکن بعض مقامات پر مولانا اصلاحی ضمیر کو نسبتاً دور کے اسم کی طرف راجع قرار دیتے ہیں اور اس کے نتائج بہت دور رس ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر سورۃ الانعام، آیت 84، میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهٰرُونَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔ اور ہم نے اس کو اسحٰق اور یعقوب عطا کیے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی اور نوح کو بھی ہم نے پہلے ہدایت بخشی، اور اس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔

یہاں ابتدا میں تو واضح ہے کہ وَهَبْنَا لَهُ (ہم نے اس کو عطا کیے) میں ضمیر کا مرجع سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں کیونکہ پیچھے انھی کا ذکر چل رہا ہے، لیکن پھر درمیان میں سیدنا نوح علیہ السلام کا ذکر آیا: وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ (نوح کو بھی ہم نے پہلے ہدایت بخشی)۔ پھر اس کے بعد وَمِن ذُرِّيَّتِهِ (اور اس کی ذریت میں سے) میں ضمیر قریب ترین اسم سیدنا نوح علیہ السلام کی طرف راجع ہے یا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف جن کے متعلق ساری بات ہو رہی ہے؟

امام ابن الجوزی نے اس مقام پر مفسرین کی آرا یوں نقل کی ہیں:

> أحدهما: أنها ترجع إلى نوح؛ رواه أبو صالح عن ابن عباس، واختاره الفراء ومقاتل وابن جرير الطبري؛ والثاني: إلى إبراهيم؛ قاله عطاء۔[12]۔ایک یہ کہ نوح (علیہ السلام) کی طرف راجع ہے؛ اس کی روایت ابو صالح نے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے کی ہے اور فراء، مقاتل اور ابن جریر طبری نے اسے اختیار کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ابراہیم (علیہ السلام) کی طرف راجع ہے؛ عطاء کا یہی قول ہے۔)

مولانا اصلاحی اس دوسری رائے کے قائل ہیں۔[13] امام رازی نے اس دوسرے قول کے قائلین کی یہ دلیل بھی ذکر کی ہے کہ اس مقام پر اصل مقصود تو ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے:

> وَاحْتَجَّ الْقَائِلُونَ بِهَذَا الْقَوْلِ: بِأَنَّ إِبْرَاهِيمَ هُوَ الْمَقْصُودُ بِالذِّكْرِ فِي هَذِهِ الْآيَاتِ وَإِنَّمَا ذَكَرَ اللَّه تَعَالَى نُوحًا لِأَنَّ كَوْنَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ أَوْلَادِهِ أَحَدُ مُوجِبَاتِ رِفْعَةِ إِبْرَاهِيمَ۔[14]۔اس قول کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ ان آیات میں اصل مقصود ابراہیم (علیہ السلام) ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے نوح (علیہ السلام) کا ذکر اس لیے کیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کا ان کی اولاد میں سے ہونا ابراہیم (علیہ السلام) کے بلند مرتبے کے اسباب میں سے ہے۔

---

[12] زاد المسیر، ج2، ص50۔

[13] تدبر قرآن، ج3، ص101۔

[14] مفاتیح الغیب، ج13، ص52۔

پہلے قول کے قائلین کی دلیل میں انھوں نے یہ بات ذکر کی ہے کہ آگے جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے، ان میں لوط علیہ السلام بھی شامل ہیں جو ابراہیم علیہ السلام کی 'ذریت' میں نہیں تھے، بلکہ تورات کے مطابق آپ کے بھتیجے تھے۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی (م 671ھ/1273ء) نے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ مذکورہ تمام انبیاء ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے تھے، خواہ وہ آپ کی صلبی اولاد نہ ہوں کیونکہ چچا کو بھی 'اَب' کہتے تھے، جیسے یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اسماعیل علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کے آباء میں شمار کیا،[15] جبکہ وہ ان کے چچا تھے اور اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں شمار کیا گیا ہے،[16] بلکہ ان کا تو باپ ہی نہیں تھا اور وہ ان کی بیٹی (سیدہ مریم) کے بیٹے تھے۔[17]

ابن عاشور نے بھی یہ تاویل ذکر کی ہے کہ لوط علیہ السلام کو ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ قریبی تعلق کی بنا پر آپ کی ذریت کہا جاسکتا ہے؛ نیز انھوں نے تاویل بھی ذکر کی ہے کہ لوط علیہ السلام کا ذکر آخر میں ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے بعد خصوصی طور پر آیا ہے جس سے مقصود آپ کی خصوصی مدح تھی۔[18]

بعض مفسرین کے مطابق سیدنا یونس علیہ السلام بھی ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے نہیں تھے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یونس علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کا ذکر انبیاء علیہم السلام کی اس فہرست میں بالکل آخر میں آتا ہے۔ اس لیے جو تاویل لوط علیہ السلام کے لیے کی گئی، کہ ان کا ذکر ذریتِ ابراہیم کے بعد آخر میں خصوصی مدح کیا گیا، وہی تاویل سیدنا یونس علیہ السلام کے لیے بھی کی گئی ہے۔[19] تاہم بائبل کے محققین کی عمومی رائے کے مطابق سیدنا یونس علیہ السلام بھی انبیائے بنی اسرائیل میں تھے۔[20] والله أعلم۔

اگر یہ تاویل مانی جائے کہ یہاں ضمیر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور سیدنا لوط علیہ السلام (یا ان کے ساتھ سیدنا یونس علیہ السلام) سے قبل مذکور تمام انبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے تھے، تو اس کے نتیجے میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دیگر مذکور انبیائے کرام کی

---

15 سورۃ البقرۃ، آیت 133۔

16 سورۃ آل عمران، آیات 33-34۔

17 أبو عبد الله محمد بن أحمد الأنصاري القرطبي، الجامع لأحكام القرآن (القاهرة: دار الكتب المصرية، 1964م)، ج7، ص31۔

18 التحریر والتنویر، ج3، ص338۔

19 امام شرف الدین الطیبی (م 743ھ/1342ء) نے لکھا ہے کہ اس صورت میں (وَيُونُسَ وَلُوطًا) کو (وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ) پر عطف مانا جاسکتا ہے اور یہ عطف الجملۃ علی الجملۃ کی صورت ہو جائے گی۔ (فتوح الغيب في الكشف عن قناع الريب، وهو حاشية الطيبي على الكشاف (دبي: جائزة دبي الدولية للقرآن الكريم، 2013م)، ج6، ص152۔ تاہم اس تاویل میں مسئلہ یہ ہے کہ (وَيُونُسَ وَلُوطًا) کا عطف (وَإِسْمَٰعِيلَ وَٱلْيَسَعَ) پر ہے اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام تو ویسے بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے اور سیدنا الیسع علیہ السلام کا بھی انبیائے بنی اسرائیل میں ہونا مسلم ہے۔

20 تفصیل کے لیے دیکھیے:
Aron Tillema, "The Book of Jonah in Recent Research," *Currents in Biblical Research*, vol. 21, no. 2 (February 2023), pp. 145-177. DOI: 10.1177/1476993X221150655.

طرح سیدنا ایوب علیہ السلام بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت اور بنی اسرائیل میں سے ہیں۔[21] واضح رہے کہ بائبل کے محققین میں اس بات پر اختلاف پایا جاتا ہے۔[22]

تیسرا مبحث: جب انتشارِ ضمائر عیب نہ ہو بلکہ حسنِ ایجاز کی وجہ سے بلاغت کی دلیل ہو۔

ضمائر کے استعمال سے متعلق ایک مسئلہ انتشارِ ضمائر کا ہے، یعنی ایک مقام پر استعمال ہونے والے ضمائر مختلف اسماء کی طرف راجع ہوں۔ اسے عموماً کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے لیکن مولانا اصلاحی قرار دیتے ہیں کہ اگر ضمائر کے مختلف مراجع کے متعلق قرائن واضح ہوں، تو ایسی صورت میں انتشارِ ضمائر عیب نہیں بلکہ کلام کی خوبی ہے کیونکہ یہ حسنِ ایجاز کی علامت ہے۔

پہلی مثال

اس کی ایک مثال سورۃ طٰہٰ، آیت 16 میں ہے:

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَن لَّا يُؤْمِنُ بِهَا۔ تو اس سے تمھیں وہ شخص غافل نہ کرنے پائے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا۔

مولانا اصلاحی کا موقف ہے کہ پہلے مقام پر ضمیر مؤنث کا مرجع الصَّلٰوةَ ہے جس کا ذکر آیت 14 میں گزر چکا ہے (وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي)، جبکہ دوسری ضمیر مؤنث کا مرجع السَّاعَةَ ہے جس کا ذکر آیت 15 میں گزر چکا ہے (إِنَّ السَّاعَةَ ءَاتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ)۔ یوں ان کے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہ بن جاتا ہے: "تو نماز سے تمھیں وہ شخص غافل نہ کرنے پائے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔" چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> "عَنْهَا میں ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک صَلٰوة ہے اور بِهَا کی ضمیر کا مرجع الساعة ہے؛ یعنی: نماز سے تمہیں وہ شخص روکنے یا غافل نہ کرنے پاوے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے۔ یہ مفہوم لینے میں اگرچہ بظاہر انتشار ضمیر کا سوال پیدا ہوتا ہے جس کو کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے لیکن انتشار ضمیر صرف اس صورت میں عیب ہے جب مرجع کے تعین کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود نہ ہو۔ اگر واضح قرینہ موجود ہو تو یہ کوئی عیب نہیں بلکہ اس سے کلام میں ایجاز کا حسن پیدا ہوتا ہے اور فصحاء کے کلام میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ یہاں قرینہ بالکل واضح ہے۔ نماز اور قیامت کے ذکر کے بعد دو فعل استعمال ہوئے ہیں ایک يَصُدَّنَّ اور دوسرا يُؤْمِنُ زبان کا ذوق رکھنے والا شخص بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ پہلا فعل صَلٰوة سے واضح مناسبت رکھتا ہے اور دوسرا قیامت سے۔ یہی رائے اگلوں میں سے ابو مسلم کی ہے اور مجھے یہ رائے ہر اعتبار سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔"[23]

---

[21] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: مولانا ابوالجلال ندوی، اعلام القرآن (لاہور: کتاب نگر، 2023ء)، ص 145-166۔ سیدنا ایوب علیہ السلام پر مولانا کا یہ مضمون اصلاً مجلہ 'معارف' کے اگست و ستمبر 1949ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا۔

[22] اگرچہ روایتی طور پر یہودی و مسیحی علماء سیدنا ایوب علیہ السلام کو بنی اسرائیل میں شمار کرتے ہیں، لیکن بائبل پر تنقید کی جدید روایت کے حاملین نے عموماً اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ وہ اسرائیلی نہیں تھے۔ اس رائے کے لیے دیکھیے:
Stephen J. Vicchio, *Job in the Ancient World* (Eugene, Oregon: Wipf & Stock, 2006); Sidney Clines, *The Book of Job: A Contest of Moral Imaginations* (Oxford: Oxford University Press, 1989); and Robert Alter, *The Wisdom Books: Job, Proverbs, Ecclesiastes* (New York: W.W. Norton, 2011).

[23] تدبر قرآن، ج 5، ص 33۔ یہ ان چند مقامات میں سے ہے جہاں مولانا اصلاحی نے پچھلوں کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ یہ رائے ان سے قبل کسی اور نے بھی اختیار کی ہے۔

عام طور پر مفسرین نے یہاں یہ رائے قائم کی ہے کہ دونوں جگہ ضمیر مؤنث الساعۃ کی طرف راجع ہے، اور پہلی جگہ مراد یہ ہے کہ 'قیامت پر ایمان لانے سے تمھیں وہ نہ روکے جو خود قیامت پر ایمان نہیں رکھتا'۔ امام ابن الجوزی کہتے ہیں:

قوله تعالى: ﴿فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا﴾ أي: عن الإيمان بها ﴿مَن لَّا يُؤْمِنُ بِهَا﴾ أي: من لا يؤمن بكونها۔[24]۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تو اس سے تمھیں غافل نہ کرنے پائے''، یعنی: اس پر ایمان لانے سے؛ ''وہ جو اس پر ایمان نہیں رکھتا''، یعنی: جو اس کے ہونے پر ایمان نہیں رکھتا۔

علامہ زمخشری کا رجحان بھی اس رائے کی طرف ہے، اگرچہ وہ دوسری رائے بھی ذکر کرتے ہیں:

أي: لا يصدنك عن تصديقها، والضمير للقيامة؛ ويجوز أن يكون للصلاة۔[25]۔ یعنی: تمھیں روک نہ پائے اس کی تصدیق سے؛ اور ضمیر قیامت کے لیے ہے، اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز کے لیے ہو۔

امام رازی نے یہ دوسری رائے ابو مسلم اصفہانی (م 322ھ/934ء) سے نقل کی ہے اور اس کی بڑی خوبصورت توجیہ ذکر کی ہے:

قَالَ أَبُو مُسْلِمٍ (لَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا) أَيْ عَنِ الصَّلَاةِ الَّتِي أَمَرْتُكَ بِهَا (مَن لَّا يُؤْمِنُ بِهَا) أَيْ بِالسَّاعَةِ: فَالضَّمِيرُ الْأَوَّلُ عَائِدٌ إِلَى الصَّلَاةِ، وَالثَّانِي إِلَى السَّاعَةِ؛ وَمِثْلُ هَذَا جَائِزٌ فِي اللُّغَةِ؛ فَالْعَرَبُ تَلُفُّ الْخَبَرَيْنِ، ثُمَّ تَرْمِي بِجَوَابِهِمَا جُمْلَةً لِيَرُدَّ السَّامِعُ إِلَى كُلِّ خَبَرٍ حَقَّهُ.[26]۔ ابو مسلم کا کہنا ہے: ''اس سے تمھیں وہ شخص غافل نہ کرنے پائے''، یعنی نماز سے جس کا میں نے تمھیں حکم دیا ہے ''وہ جو اس پر ایمان نہیں رکھتا''، یعنی قیامت پر؛ پس پہلا ضمیر نماز کی طرف اور دوسرا قیامت کی طرف راجع ہے؛ لغت میں ایسا کرنا جائز ہے؛ پس عرب دو خبریں اکٹھی ذکر کرتے ہیں، پھر ان کے جواب میں ایسا جملہ ذکر کرتے ہیں کہ سامع ہر خبر کو اس کا حق دے سکے۔

آگے امام رازی اس رائے کے خلاف یہ دلیل ذکر کرتے ہیں کہ ضمیر اصولاً قریب ترین اسم کی طرف راجع ہوتا ہے اور بعید کی طرف اس کا راجع ہونا صرف بوقتِ ضرورت مانا جا سکتا ہے، جبکہ یہاں ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس ضرورت کی وضاحت اس پہلو سے کی ہے کہ ایک فعل کی مناسبت نماز سے اور دوسرے کی مناسبت آخرت سے ہے۔ کشاف کے محشّی علامہ طیبی نے بھی اس دوسری رائے کو اسی پہلو سے ترجیح دی ہے۔[27]

دوسری مثال

ایک اور مثال سورۃ مریم، آیت 24 میں ہے جہاں سیدہ مریم رضی اللہ عنہا کی کڑی آزمائش کے ذکر کے ضمن میں ارشاد ہوتا ہے:

فَنَادَىٰهَا مِن تَحْتِهَآ أَلَّا تَحْزَنِي۔ پس اس (کھجور) کے نیچے سے اس (فرشتہ) نے اس (مریم) کو آواز دی کہ مغموم نہ ہو۔

---

[24] زاد المسیر، ج3، ص155۔
[25] الکشاف، ج3، ص56۔
[26] مفاتیح الغیب، ج22، ص22۔
[27] فتوح الغیب، ج10، ص147۔

مولانا اصلاحی کے نزدیک یہاں فَنَادٰىهَا (اس کو آواز دی) میں فاعل جبریل امین ہیں، اور ضمیر مؤنث کا مرجع تو سیدہ مریم رضی اللہ عنہا ہیں، جبکہ مِن تَحۡتِهَا (اس کے نیچے سے) میں ضمیر مؤنث کا مرجع النَّخۡلَةِ (کھجور) ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں گزر چکا ہے (فَأَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ إِلَىٰ جِذۡعِ النَّخۡلَةِ)۔[28]

قدیم مفسرین عموماً اس مقام پر دو قراءات کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک تو یہی معروف قراءت ہے، جبکہ دوسری قراءت میں مِن تَحۡتِهَا (اس کے نیچے سے) کی جگہ مَن تَحۡتَهَا (جو اس کے نیچے تھا) آیا ہے۔ امام فراء (م 207ھ) کہتے ہیں کہ دونوں قراءات میں مراد جبریل ہیں؛[29] گویا دونوں قراءتوں پر آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ 'اس' کے نیچے سے جبریل نے آواز دی؛[30] لیکن 'اس' سے مراد کیا ہے؟ امام ابن الجوزی نے 'اس' کی تاویل میں دو قول نقل کیے ہیں: سے ایک یہ کہ مراد سیدہ مریم ہیں اور گویا وہ اوپر تھیں اور جبریل ان سے نیچے تھے، جبکہ دوسرے قول کے مطابق جبریل نے کھجور کے درخت کے نیچے سے سیدہ مریم کو آواز دی۔[31] یہ دوسرا قول امام رازی نے مشہور تابعی مفسر امام ابو عبد اللہ عکرمہ بربری (م 104ھ/723ء) سے، اور علامہ زمخشری نے مشہور تابعی مفسر امام ابو الخطاب قتادہ بن دعامہ الدوسی (م 117/735ء) سے نقل کیا ہے۔[32]

تیسری مثال

یہ بات کہ فعل کی مناسبت ایک قرینہ بن جاتی ہے، مولانا اصلاحی نے سورۃ الفتح، آیت 9، کی تاویل میں بھی کہی ہے:

> لِّتُؤۡمِنُواْ بِاللهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكۡرَةً وَأَصِيلًا۔ تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اس کی مدد کرو، اس کی توقیر کرو اور اس کی تسبیح کرو صبح و شام۔)

مولانا اصلاحی قرار دیتے ہیں کہ تعزیر اور توقیر کے افعال کی مناسبت رسول کے ساتھ اور تسبیح کی مناسبت اللہ کے ساتھ ہے، اس لیے پہلے دو مقامات پر ضمیر مذکر کا مرجع رسول اور آخری مقام پر اس کا مرجع اللہ ہے:

> "تعزیر اور توقیر کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں نہیں ہیں، یہ اپنے مواقع استعمال کے لحاظ سے رسول ہی کے لیے موزوں ہیں۔ وَتُوَقِّرُوهُ کا لفظ تو اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے۔ تُعَزِّرُوهُ بھی کہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں استعمال ہوا ہے۔ جہاں بھی استعمال ہوا ہے رسولوں ہی کے لیے ہوا ہے۔۔۔ قرآن میں بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں مختلف افعال استعمال ہوئے ہیں اور صرف فعل سے یہ متعین ہوتا ہے

---

[28] تدبر قرآن، ج4، ص646۔

[29] وهو الملك في الوجهين جَميعًا۔ أبو زكريا يحيى بن زياد بن عبد الله بن منظور الديلمي الفراء، معاني القرآن (بیروت: عالم الکتب، 1983ء)، ج2، ص165۔

[30] بعض مفسرین نے آواز دینے والے سے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام مراد لیے ہیں اور اسے ان کے ارہاصات اور سیدہ مریم کی کرامات میں شمار کیا ہے۔ التحریر والتنویر، ج16، ص87۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ مَن تَحۡتَهَا میں ضمیر کو سیدہ مریم کی طرف راجع سمجھا جاتا ہے۔

[31] أحدهما: ناداها الملك من تحت النخلة. وقيل: كانت على نَشَز، فناداها الملك أسفل منها۔ (زاد المسیر، ج3، ص126) تقریباً یہی باتیں دیگر کئی مفسرین نے اختصار یا تفصیل سے لکھی ہیں۔

[32] الکشاف، ج3، ص12؛ مفاتیح الغیب، ج21، ص527۔

کہ ان میں سے کسی فعل کا فاعل یا مفعول کون ہے۔ اس چیز کا تعلق زبان کے ذوق سے ہے۔ اگر اس کا پورا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس سے آیات کی تاویل میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔''[33]

چنانچہ مولانا اصلاحی کے نزدیک اس آیت کا مناسب ترجمہ یوں ہے: ''تا کہ لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ رسول کی مدد اور اس کی توقیر کرو اور اللہ کی تسبیح کرو صبح و شام۔''

اس مقام پر امام ابن الجوزی کہتے ہیں کہ وَتُوَقِّرُوهُ پر اکثر قراء نے وقف اختیار کیا ہے کیونکہ اگلے فعل میں ضمیر کا مرجع مختلف ہے:

واختار كثير من القرّاء الوقف هاهنا، لاختلاف الكناية فيه وفيما بعده. قوله تعالى: (وَتُسَبِّحُوهُ) هذه الهاء ترجع إلى الله عزّ وجلّ. [34]۔ بہت سے قاریوں نے یہاں وقف اختیار کیا ہے کیونکہ یہاں ضمیر کا مرجع اس کے بعد ضمیر کے مرجع سے مختلف ہے؛ ارشادِ باری تعالیٰ ''اور اس کی تسبیح کرو'' میں ہا اللہ عزّ و جلّ کی طرف راجع ہے۔

تاہم علامہ زمخشری کو اس رائے سے اختلاف ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تینوں افعال میں ضمیر کا مرجع اللہ ہے اور وہ پہلے دو افعال میں ضمیر کو رسول کی طرف لوٹانے کے بجائے ان افعال کے مفہوم کی تاویل کرتے ہیں:

والضمائر لله عز وجلّ؛ والمراد بتعزير الله: تعزير دينه ورسوله صلى الله عليه وسلم. ومن فرق الضمائر فقد أبعد۔[35]۔ تمام ضمائر اللہ عزّ و جلّ کے لیے ہیں؛ اور اللہ کی تعزیر (مدد) سے مراد اس کے دین اور اس کے رسول ﷺ کی مدد ہے؛ اور جس نے ضمائر میں فرق کیا، اس کی بات کمزور ہے۔

امام رازی بھی اسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں:

الكنايات المذكورة --- رَاجِعَةٌ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى أَوْ إِلَى الرَّسُولِ عَلَيْهِ الصلاة والسلام؟ والأصح هو الأول۔[36]۔ مذکورہ ضمائر --- اللہ تعالیٰ کی طرف یا رسول علیہ الصلاۃ والسلام کی طرف راجع ہیں، اور پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

علامہ ابن عاشور بھی یہی رائے رکھتے ہیں اور جن تفسیری روایات میں یہ آیا ہے کہ پہلے دو مقامات پر ضمیر کا مرجع رسول ہیں، ان کی وہ تاویل کرتے ہیں:

عَطْف (وَرَسُولِهِ) عَلَى لَفْظِ الْجَلَالَةِ اعْتِدَادٌ بِأَنَّ الْإِيمَان بالرسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيمَانٌ بِاللَّهِ، فَالْمَقْصُودُ هُوَ الْإِيمَانُ بِاللَّهِ. وَمِنْ أَجْلِ ذَلِكَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِي بَعْضِ الرِّوَايَاتِ عَنْهُ: إِنَّ ضَمِيرَ (تُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ) عَائِدٌ إِلَى رَسُولِهِ۔[37]۔ اور اس کے رسول پر'' کا لفظ الجلالہ پر عطف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول ﷺ پر ایمان اللہ پر ایمان ہے، کیونکہ مقصود اللہ پر ایمان ہے؛ اور اس وجہ سے بعض روایات کے مطابق ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے کہا کہ ''اس کی توقیر کرو'' میں ضمیر رسول کی طرف راجع ہے۔

---

[33] تدبر قرآن، ج7، ص450۔

[34] زاد المسیر، ج4، ص129۔

[35] الکشاف، ج4، ص335۔

[36] مفاتیح الغیب، ج28، ص73۔

[37] التحریر والتنویر، ج26، ص156۔

تاہم امام شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیہ (م 751ھ/1350ء) اس کے برعکس اس رائے کو ترجیح دیتے ہیں کہ پہلے دو مقامات پر ضمیر رسول کی طرف راجع ہے اور اس کی دلیل وہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ ان مقامات پر فعل کی مناسبت رسول کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے وہ ایک مثال بھی ذکر کرتے ہیں:

> وتأمل قوله تعالى: (وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ)،[38] كيف جعل الطاعة لله ولرسوله، والخشية والتقوى له وحده؛ وقال تعالى: (لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ)،[39] كيف جعل التوقير والتعزير للرسول وحده، والتوقير هو التعظيم الصادر عن الهيبة والإجلال۔[40] غور کرو ارشادِ باری تعالیٰ پر: ''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے اور جو اس سے ڈریں گے اور اس کے حدود کی پاس داری کریں گے، وہی لوگ کامیاب ہوں گے''؛ کیسے اطاعت کو اللہ اور اس کے رسول دونوں کے لیے کر دیا اور خشیت اور تقوی کو صرف اپنے لیے خاص کر دیا؛ اور اس ارشادِ باری تعالیٰ پر: ''تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اس کی مدد کرو، اس کی توقیر کرو''؛ کیسے) توقیر اور تعزیر کو صرف رسول کے لیے خاص کر دیا؛ توقیر وہ تعظیم ہوتی ہے جو ہیبت اور جلال کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

چوتھا مبحث: جب ضمیر کا مرجع بعینہ مراد نہ ہو، بلکہ اس کی مثل مراد ہو۔

ضمائر کا ایک دلچسپ استعمال وہ ہے جہاں ان سے مراد بعینہ وہی کچھ نہ ہو جو پیچھے مذکور ہوا، بلکہ اس نوع اور اس طرح کی چیز ہو۔

پہلی مثال

مثلاً سورۃ المائدۃ، آیت 101، میں مسلمانوں کو غیر ضروری سوالات سے منع فرمایا، پھر آیت 102 میں فرمایا:

> قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ۔ یہ باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھیں تو وہ ان کے منکر ہو کے رہ گئے۔

مولانا اصلاحی کہتے ہیں:

> قَدْ سَأَلَهَا میں ضمیر کا مرجع مذکورہ سوال ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انھوں نے بعینہٖ وہی سوالات کیے جن کی طرف اوپر اشارہ ہے بلکہ مراد ہے کہ اس نوعیت کے سوالات کیے۔ عربی میں ضمیروں کا استعمال اس طرح بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔[41]

چنانچہ ان کے نزدیک اس آیت کا مناسب ترجمہ یہ ہے: ''اسی طرح کی باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھیں تو وہ ان کے منکر ہو کے رہ گئے۔''

قدیم مفسرین اس مقام پر ایک تو یہ بحث کرتے ہیں کہ یہاں سوال کے ساتھ 'عن' کا صلہ کیوں استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ اس سے پچھلی آیت 101 میں فرمایا:

---

[38] سورۃ النور، آیت 52۔

[39] سورۃ الفتح، آیت 9۔

[40] شمس الدين محمد بن أبي بكر ابن قيم الجوزية، طريق الهجرتين ومفتاح السعادتين (القاهرة: الدار السلفية، 1394ھ)، ص 292۔

[41] تدبر قرآن، ج 2، ص 601۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَسْـَٔلُوا۟ عَنْ أَشْيَآءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِن تَسْـَٔلُوا۟ عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْءَانُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ-اے ایمان والو! ایسی باتوں سے متعلق سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں گراں گزریں اور اگر تم ان کی بابت ایسے زمانے میں سوال کرو گے جب قرآن اتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔اللہ نے ان سے در گزر فرمایا۔اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔

اس سوال کا جواب علامہ زمخشری و دیگر مفسرین نے یہ دیا ہے کہ یہ بات 'اشیاء' کے متعلق سوال کے بارے میں نہیں کہی گئی، بلکہ غیر ضروری سوالات پوچھنے کے رویے کے متعلق ہے،اور اس لیے یہاں 'عن' نہیں آیا:

الضمير في: (سَأَلَها) ليس براجع إلى أشياء حتى تجب تعديته بعن؛ وإنما هو راجع إلى المسألة التي دل عليها (لا تَسْئَلُوا) يعنى قد سأل قوم هذه المسألة من الأولين، ثُمَّ أَصْبَحُوا بِها أى بمرجوعها أو بسببها كافِرِينَ؛ وذلك أنّ بنى إسرائيل كانوا يستفتون أنبياءهم عن أشياء؛ فإذا أمروا بها، تركوها، فهلكوا۔[42]۔(''یہ باتیں پوچھیں'') میں ضمیر کے ساتھ ''عن'' کا ہونا اس لیے ضروری نہیں کہ ضمیر چیزوں کی طرف راجع نہیں ہے، بلکہ پوچھنے کی طرف راجع ہے جس پر ''سوال نہ کرو'' کے الفاظ دلالت کرتے ہیں؛یعنی ایک پچھلی قوم نے یہ سوال کیا، پھر اس کی وجہ سے،یعنی اس کے مرجوع یا سبب کی بنا پر، کافر ہو گئی؛اور وہ اس طرح کہ بنی اسرائیل اپنے انبیاء سے چیزوں کے متعلق پوچھتے تھے، پھر جب انھیں ان کے متعلق حکم دیا جاتا، تو وہ اس پر عمل نہ کرتے اور یوں ہلاک ہو جاتے۔)

امام رازی نے بھی یہاں ایک تاویل یہی ذکر کی ہے۔[43]

تاہم اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھے جانے والے سوالات بعینہ وہ سوالات نہیں تھے جو پچھلی قوموں کے تھے، تو پھر ان کی طرف وہی ضمیر کیسے عائد ہوئی؟امام رازی نے اس سوال کے جواب میں واضح کیا ہے کہ دو الگ انواع کے سوالات کے لیے بھی ایک ضمیر کا آنا کیوں درست ہے؟

أَنَّهُمَا، وَإِنْ كَانَا نَوْعَيْنِ مُخْتَلِفَيْنِ، إِلَّا أَنَّهُمَا فِي كَوْنِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مسؤولا عَنْهُ شَيْءٌ وَاحِدٌ، فَلِهَذَا الْوَجْهِ حَسُنَ اتِّحَادُ الضَّمِيرِ، وَإِنْ كَانَا فِي الْحَقِيقَةِ نَوْعَيْنِ مُخْتَلِفَيْنِ۔[44]۔اس لیے کہ یہ دونوں اگرچہ دو مختلف قسمیں لیکن ان میں سے ہر پوچھے جانے کے لحاظ سے ایک ہیں۔اس وجہ سے ان کے لیے ایک ضمیر کا آنا درست ہے، خواہ حقیقت میں یہ دو مختلف قسمیں ہوں۔

تاہم امام ابن القیم نے جو بات کہی ہے اسے دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی نے یہ بات انھی سے لی ہے:

---

[42] الکشاف، ج1، ص684۔ بعض مفسرین نے یہاں یہ رائے قائم کی ہے کہ قَدْ سَأَلَهَا میں مراد معجزات کا مطالبہ ہے، جیسا کہ سورۃ النسآء کی آیت 153 میں فرمایا: يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ الْكِتَٰبِ أَن تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ ۚ فَقَدْ سَأَلُوا۟ مُوسَىٰٓ أَكْبَرَ مِن ذَٰلِكَ فَقَالُوٓا۟ أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصَّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا۟ الْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَٰتُ فَعَفَوْنَا عَن ذَٰلِكَ ۚ وَءَاتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطَٰنًا مُّبِينًا۔امام قرطبی فرماتے ہیں: أَخْبَرَ تَعَالَى أَنَّ قَوْمًا مِنْ قَبْلِنَا قَدْ سَأَلُوا آيَاتٍ مِثْلَهَا؛ فَلَمَّا أُعْطُوهَا، وَفُرِضَتْ عَلَيْهِمْ، كَفَرُوا بِهَا، وَقَالُوا: لَيْسَتْ مِنْ عِنْدِ اللهِ؛ وَذَلِكَ كَسُؤَالِ قَوْمِ صَالِحٍ النَّاقَةَ، وَأَصْحَابِ عِيسَى الْمَائِدَةَ؛ وَهَذَا تَحْذِيرٌ مِمَّا وَقَعَ فِيهِ مَنْ سَبَقَ مِنَ الْأُمَمِ۔(الجامع لاحکام القرآن، ج6، ص334)

[43] مفاتیح الغیب، ج12، ص446۔

[44] ایضاً، ص445۔

أراد نوع تلك المسائل، لا أعيانها؛ أي قد تعرَّضَ قوم من قبلكم لأمثال هذه المسائل؛ فلما بُيِّنَت لهم، كفروا بها؛ فاحذروا مشابهتَهُم والتعرُّضَ لما تعرضوا له۔[45] مراد ان نوعیت کے سوالات ہیں، نہ کہ بعینہ یہی سوالات؛ یعنی تم سے پہلے کچھ لوگ اس طرح کے سوالات میں پڑتے تھے، پھر جب انھیں ان کی وضاحت دی جاتی، تو وہ ان کا انکار کر بیٹھتے؛ پس بچو ان کی مشابہت سے اور اس کام میں پڑنے سے جس میں وہ پڑ گئے تھے۔)

دوسری مثال

ضمیر کے اس استعمال کی ایک مثال سورۃ الشعر آء، آیت 59، میں ہے:

كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ۔ اسی طرح ہم کرتے ہیں، اور ہم نے ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو۔

کیا یہاں مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو وہ باغات اور چشمے اور دیگر چیزیں دی گئیں جو اس وقت تک فرعون کے پاس تھیں؟ کئی مفسرین نے اس ضمیر کی وجہ سے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل پھر مصر گئے اور وہاں ان کو یہ نعمتیں ملیں جو پہلے فرعون کے پاس تھیں۔ مثال کے طور پر امام ابن الجوزی کہتے ہیں:

وذلك أن الله تعالى ردَّهم إلى مصر بعد غرق فرعون؛ وأعطاهم ما كان لفرعون وقومه من المساكن والأموال۔[46] یہ یوں ہوا کہ فرعون کی غرقابی کے بعد اللہ تعالیٰ انھیں واپس مصر لے گیا اور انھیں فرعون اور اس کی قوم کے محلات اور اموال دے دیے۔

تاہم بنی اسرائیل کا واپس مصر جانا تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے اور بائبل اور قرآن مجید دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد ان کا سفر شام و فلسطین ہی کی طرف جاری رہا۔ مولانا اصلاحی کہتے ہیں:

وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ میں ضمیر مفعول سے مراد بعینہٖ وہی نعمتیں نہیں ہیں جن سے قبطیوں کو اللہ تعالیٰ نے نکالا بلکہ اسی نوع کی وہ نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے کے بعد سرزمین فلسطین میں حاصل ہوئیں۔[47]

اس کے لیے وہ سورۃ الاعراف، آیت 137، سے استدلال کرتے ہیں:

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ۔ اور جو لوگ دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث ٹھہرایا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہوا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی ساری تعمیرات اور ان کے سارے باغ و چمن ملیامیٹ کر دیے۔

مولانا اصلاحی مزید کہتے ہیں:

اس آیت میں 'ارض مبارک' سے مراد ظاہر ہے کہ سرزمین فلسطین ہے۔ مصر سے نکلنے اور صحرا گردی کا دور ختم ہونے کے بعد یہی زرخیز علاقہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا ہے۔ مصر یا مملکت مصر کے کسی علاقے پر بنی اسرائیل کا قبضہ تاریخوں سے ثابت نہیں ہے۔ ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ ہم نے ضمیر کا مرجع معین کرنے میں یہاں تکلف سے کام لیا ہے۔ آیت کا ظاہر مفہوم تو یہی معلوم ہوتا ہے

---

[45] إعلام الموقعين عن رب العالمين (بيروت: دار الكتب العلمية، 1991م)، ج2، ص136۔

[46] زاد المسیر، ج3، ص340۔

[47] تدبر قرآن، ج5، ص516۔

کہ جن باغوں، چشموں اور خزانوں سے اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو بے دخل کیا انہی کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ اعلیٰ عربی میں ضمیریں اس طرح بھی آتی ہیں۔''[48]

یہی بات ان سے قبل علامہ ابن عاشور نے بھی کہی ہے:

وَالْمَعْنَى: أَنَّ اللَّهَ أَرْزَأَ أَعْدَاءَ مُوسَى مَا كَانَ لَهُمْ مِنْ نَعِيمٍ إِذْ أَهْلَكَهُمْ وَأَعْطَى بَنِي إِسْرَائِيلَ خَيْرَاتٍ مِثْلَهَا لَمْ تَكُنْ لَهُمْ--- فَإِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَمْ يَمْلِكُوا مِصْرَ بَعْدَ خُرُوجِهِمْ مِنْهَا سَائِرَ الدَّهْرِ؛ فَلَا مَحِيصَ مِنْ صَرْفِ الْآيَةِ عَنْ ظَاهِرِهَا إِلَى تَأْوِيلٍ يَدُلُّ عَلَيْهِ التَّارِيخُ وَيَدُلُّ عَلَيْهِ مَا فِي سُورَةِ الدُّخَانِ.[49]۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کے دشمنوں کو ان نعمتوں سے محروم کر کے انھیں ہلاک کر دیا اور بنی اسرائیل کو اس طرح کی ایسی نعمتیں دیں جو پہلے ان کے پاس نہیں تھیں۔۔۔ کیونکہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل نے کبھی بھی وہاں اقتدار حاصل نہیں کیا؛ اس لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ آیت کو اس کے ظاہر سے ہٹا کر اس کی وہ تاویل کی جائے جو تاریخ سے بھی معلوم ہوتی ہے اور سورۃ الدخان سے بھی۔)

اس کے بعد انھوں نے ضمیر کے اس استعمال کی وضاحت یوں کی ہے:

فَضَمِيرُ (أَوْرَثْنَاهَا) هُنَا عَائِدٌ لِلْأَشْيَاءِ الْمَعْدُودَةِ بِاعْتِبَارِ أَنَّهَا أَسْمَاءُ أَجْنَاسٍ؛ أَيْ أَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ جَنَّاتٍ وَعُيُونًا وَكُنُوزًا؛ فَعَوْدُ الضَّمِيرِ هُنَا إِلَى لَفْظٍ مُسْتَعْمَلٍ فِي الْجِنْسِ--- أَيْ أَعْطَيْنَاهُمْ أَشْيَاءَ مَا كَانَتْ لَهُمْ مِنْ قَبْلُ، وَكَانَتْ لِلْكَنْعَانِيِّينَ، فَسَلَّطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَغَلَبُوهُمْ عَلَى أَرْضِ فِلَسْطِينَ وَالشَّامِ.[50]۔ ہم نے انھیں وارث بنایا'' میں ضمیر مذکورہ اشیاء کی طرف اس بنا پر عائد ہے کہ وہ اسماء جنس ہیں؛ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو باغات، چشموں اور خزانوں کا وارث بنایا؛ پس یہاں ضمیر ایسے لفظ کی طرف عائد ہے جو جنس کے لیے استعمال ہوا ہے۔۔۔ یعنی ہم نے ان کو وہ کچھ دیا جو پہلے ان کے پس نہیں تھا، اور کنعانیوں کے پاس تھا، تو اللہ نے بنی اسرائیل کو ان پر مسلط کیا جنھوں نے فلسطین و شام کی سرزمین پر غلبہ حاصل کیا۔

ضمیر کے اس استعمال کے لیے علامہ ابن عاشور نے ایک خوبصورت مثال سورۃ النسآء سے بھی پیش کی ہے:

وَقَدْ يَعُودُ الضَّمِيرُ عَلَى اللَّفْظِ دُونَ الْمَعْنَى كَمَا فِي--- قَوْلِهِ تَعَالَى: (إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ)؛[51] إِذْ لَيْسَ الْمُرَادُ أَنَّ الْمَرْءَ الَّذِي هَلَكَ يَرِثُ أُخْتَهُ الَّتِي لَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ؛ بَلِ الْمُرَادُ: وَالْمَرْءُ يَرِثُ أُخْتًا لَهُ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ.[52]۔ بعض اوقات ضمیر صرف لفظ کی طرف عائد ہوتا ہے اور معنی کی طرف نہیں، جیسے۔۔۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اگر کوئی شخص مرے، اس کے کوئی اولاد نہ ہو، اس کے ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے ترکہ کا نصف ہے اور وہ مرد اس بہن کا وارث ہو گا اگر اس بہن کے کوئی اولاد نہ ہو''؛ کیونکہ یہاں مراد یہ نہیں کہ جو شخص مر گیا وہ اپنی اس بہن کی میراث پائے گا جس کے لیے اس شخص کے ترکے کا نصف تھا؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی بہن کی میراث پائے گا اگر اس بہن کی اولاد نہ ہو۔

---

[48] ایضاً، ص516-517۔

[49] التحریر والتنویر، ج19، ص133۔

[50] ایضاً۔

[51] سورۃ النسآء، آیت176۔

[52] التحریر والتنویر، ج19، ص133-134۔

نتائج بحث

1. ضمائر کے استعمال کے متعلق عام اصول یہ ہیں کہ ان کا مرجع کلام میں پیچھے مذکور ہوتا ہے، یہ کہ وہ قریب ترین اسماء کی طرف راجع ہوتے ہیں، یہ کہ انتشارِ ضمائر کو کلام کا عیب سمجھا جاتا ہے اور یہ کہ ضمائر سے مراد بعینہ وہ اسماء ہوتے ہیں جن کی طرف یہ ضمائر راجع ہوتے ہیں۔ تاہم بلیغ کلام میں بعض اوقات ان اصولوں سے انحراف نظر آتا ہے کیونکہ بلاغت کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کے ایسے مقامات کی توضیح مولانا اصلاحی نے 'تدبرِ قرآن' میں بہت خوبی سے کی ہے۔
2. تاہم ان مقامات کی توضیح میں مولانا اصلاحی کی رائے ان کا تفرّد نہیں ہے، نہ ہی کوئی انوکھی رائے ہے، بلکہ قدیم تفسیری ذخیرے میں یہ رائے بیان ہوتی آئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معاصر اردو تفاسیر میں اس رائے کو زیادہ ذکر نہیں کیا گیا، اور اس وجہ سے مولانا اصلاحی کی رائے بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی ہے اور بعض لوگ اسے مولانا اصلاحی کی خصوصیت سمجھتے ہیں۔
3. اس تاثر کے وجود میں لانے کے لیے بڑی حد تک خود مولانا اصلاحی ذمہ دار ہیں کیونکہ ایک تو ان کی تفسیر میں عموماً تفسیری ذخیرے کے حوالے نہیں دیے جاتے اور پھر مفسرین کا ذکر عموماً منفی پہلو سے کیا جاتا ہے۔[53] تاہم دو مفسرین ایسے ہیں جن کا ذکر ان کے ہاں کثرت سے ملتا ہے: ایک، علامہ زمخشری، اور دوسرے، امام ابن جریر طبری۔[54] ان کے علاوہ انھوں نے تفسیر میں بھی اور دیگر کتب میں بھی امام ابن القیم کی تفسیری افادات کا بہت مثبت انداز میں ذکر کیا ہے۔[55]
4. ضمائر کے استعمالات کی جو مثالیں اس مقالے میں ذکر کی گئیں، وہ زیادہ تر انھی مآخذ میں مذکور ہیں اور چند ایک ان کے علاوہ دیگر تفسیری مآخذ سے لی گئی ہیں۔ ان میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے جس میں مولانا اصلاحی کی اختیار کردہ رائے قدیم تفسیری ذخیرے میں موجود نہ ہو۔ اس لیے ان مقامات پر ان کی رائے نہ تو پہلی دفعہ آئی ہے، نہ ہی اسے تفرد کہا جا سکتا ہے۔

---

[53] بہت سارے مقامات پر مولانا اصلاحی نام لیے بغیر عمومی انداز میں مفسرین کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی ''الجھن کے ازالے'' یا ان کی ''غلط فہمی'' کا عنوان قائم کر کے تنقیدی شذرہ لکھ لیتے ہیں۔ مثلاً دیکھیے: تدبر قرآن، ج3، ص512-513؛ ج4، ص570-571؛ ج6، ص480-481؛ ج8، ص140-141؛ اور ج9، ص561-562۔

[54] سب سے زیادہ ذکر مولانا اصلاحی نے علامہ زمخشری کا کیا ہے، کبھی نام لے کر، کبھی 'صاحبِ کشاف' کہہ کر اور کبھی نام لیے بغیر ان کی بات ذکر کر کے۔ ایسے چند مقامات کے لیے درج ذیل آیات کی تفسیر دیکھیے: سورۃ البقرۃ، آیت 182؛ سورۃ ہود، آیت 27؛ سورۃ طٰہٰ، آیت 77؛ سورۃ الانبیاء، آیت 34؛ سورۃ القلم، آیت 6۔ امام طبری کا ذکر عموماً مولانا اصلاحی 'ابن جریر' کے نام سے کرتے ہیں؛ مثال کے طور پر درج ذیل آیات کی تفسیر دیکھیے: سورۃ البقرۃ، آیت 27؛ سورۃ آل عمران، آیت 76؛ سورۃ الاعراف، آیت 46؛ سورۃ الاحزاب، آیت 37۔ حافظ ابوالفداء عماد الدین اسماعیل بن عمر ابن کثیر (م774ھ/1373ء) کا ذکر بھی مولانا اصلاحی نے کئی مقامات پر کیا ہے؛ مثلاً دیکھیے درج ذیل آیات کی تفسیر: سورۃ البقرۃ، آیت 7؛ سورۃ الشعراء، آیت 96؛ سورۃ الاحزاب، آیات 37-38؛ سورۃ الرحمٰن، آیت 6۔ امام رازی کا نام لے کر ذکر انھوں نے ایک آدھ مقام پر ہی کیا ہے، جیسے سورۃ فصلت، آیت 45 اور سورۃ الکوثر، آیت 1 کی تفسیر میں، لیکن بعض مقامات پر ان کی تفسیر سے ان کی، یا کسی اور کی رائے لی ضرور ہے مگر امام رازی کا نام لیے بغیر، جیسے سورۃ طٰہٰ کی آیت 16 کی تفسیر میں ابو مسلم اصفہانی کی رائے انھوں نے تفسیر کبیر سے لی ہے، لیکن حوالہ نہیں دیا۔ قاضی عبداللہ بن عمر البیضاوی (م684ھ/1286ء) کا نام لے کر ذکر انھوں نے ایک ہی مقام پر (سورۃ البقرۃ، آیت 34 کی تفسیر میں) کیا ہے۔ ان تفسیروں کے متعلق مولانا اصلاحی نے اپنی ایک ابتدائی کتاب میں اپنی رائے تفصیل سے بتائی ہے؛ دیکھیے: مبادیِ تدبرِ قرآن (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، 1991ء)، ص75-86۔

[55] امام ابن القیم کا نام لے کر ذکر تدبر قرآن میں انھوں نے، کم از کم دو مقامات پر (سورۃ الانعام، آیت 57 اور سورۃ العنکبوت، آیت 33 کی تفسیر میں) کیا ہے اور اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے استاذ مولانا حمید الدین فراہی (م1930ء) کی کتاب الإمعان في أقسام القرآن کا اردو ترجمہ بھی کیا جس میں مولانا فراہی نے امام ابن القیم کی کتاب التبیان في أقسام القرآن کا اچھے انداز میں (اور ہلکی سی تنقید کے ساتھ) ذکر کیا ہے۔

5. البتہ یہ بات اہم ہے کہ ان مقامات پر مولانا اصلاحی نے جو راے اختیار کی ہے، وہ ان کے عمومی اصولی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ نیز انھوں نے یہ راے جس اصول کی بنیاد پر لی، اس اصول کی پابندی انھوں نے ہر مقام پر کی اور اصولی تناقض میں مبتلا نہیں ہوئے۔